شریعت بل، پارلیمنٹ کی خود مختاری اور اجتہاد

ڈاکٹر جاوید اقبال کے افکار پر ایک نظر

صدر مملکت کی طرف سے قومی اسمبلی توڑے جانے کے بعد عوامی سطح پر شریعت بل کے بارے میں بحث وتمحیص کا سلسلہ اگرچہ وقتی طور پر رک گیا ہے اور شریعت بل کی منظوری اور نفاذ کے بارے میں لوگ ۲۴ اکتوبر کو معرضِ وجود میں آنے والی قومی اسمبلی کا انتظار کر رہے ہیں لیکن اہل دانش کی طرف سے شریعت بل پر بحث وتمحیص کا سلسلہ جاری ہے چنانچہ ملک کے دو معروف قانون دانوں ریٹائرڈ جسٹس جناب ڈاکٹر جاوید اقبال اور جناب ملک امجد حسین ایڈووکیٹ کے مضامین گزشتہ دنوں روزنامہ جنگ کے ادارتی صفحات کی زینت بنے ہیں جن میں شریعت بل کے حوالہ سے چند نکات زیر بحث لائے گئے ہیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان مضامین کے اہم نکات کا مختصر جائزہ لے لیا جائے تاکہ تصویر کے دونوں رخ قارئین کے سامنے رہیں اور انہیں کسی نتیجہ تک پہنچنے میں دشواری پیش نہ آئے۔

جناب ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنے مضمون میں جن نکات پر سب سے زیادہ زور دیا ہے وہ یہ ہیں۔

● تحریک پاکستان میں عوام نے علماء کی سوچ کو مسترد کر کے علامہ محمد اقبالؒ اور قائد اعظمؒ کی سوچ کو اپنایا تھا اس لیے پاکستان میں اسلام کا نفاذ علماء کی بجائے علامہ محمد اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ کی سوچ اور فکر کے مطابق ہونا چاہیئے۔

● عصرِ حاضر کی ضروریات اور تقاضوں کے مطابق اسلامی احکام میں وسیع تر اجتہاد کی ضرورت ہے اور علماء مختلف وجوہ کی بناء پر اجتہاد کی صلاحیت سے بہرہ ور نہیں رہے اس لیے دین کی تعبیر وتشریح اور اجتہاد کے تمام تر اختیارات منتخب پارلیمنٹ کے حوالہ کر دینے چاہئیں۔

——— • پارلیمنٹ کی بالادستی سے شریعت کی توہین ہوتی ہے اور شریعت کی بالادستی سے پارلیمنٹ کی خودمختاری مجروح ہوتی ہے اس لیے قانون نفاذ شریعت میں "قطع وبرید" کرکے کوئی درمیانی راہ نکالنی چاہیئے۔

جب کہ جناب ملک امجد حسین ایڈووکیٹ کے اٹھائے ہوئے زیادہ اہم نکات درج ذیل ہیں۔

——— • قرارداد مقاصد میں کسی جگہ بھی شریعت کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا اس لیے شریعت بل کا قرارداد مقاصد کے ساتھ تعلق جوڑ کر علماء کرام قرارداد مقاصد کی غلط تشریح کر رہے ہیں۔

——— • جنرل محمد ضیاء الحق مرحومؒ نے قرارداد مقاصد کو آئین کا واجب العمل حصہ بنا کر غلطی کی ہے کیونکہ سیاسی حالات کے مدّوجزر میں آئین کے ٹوٹنے اور معطل ہونے کا خطرہ رہتا ہے اس لیے قراردادِ مقاصد کو آئین کا عملی حصہ بنا کر اسے بھی معرضِ خطر میں ڈال دیا گیا ہے

جہاں تک تحریک پاکستان میں علماء کی سوچ کو عوام کی طرف سے مسترد کیے جانے کا تعلق ہے ہمیں افسوس ہے کہ تاریخی حقائق اس دعوے میں جناب ڈاکٹر جاوید اقبال کا ساتھ نہیں دے رہے کیونکہ علماء کے ایک طبقہ نے تحریکِ پاکستان کی ضرور مخالفت کی تھی اور وہ اپنی اس مخالفت پر کسی قسم کا نقاب ڈالنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ لیکن علماء ہی کا ایک بہت بڑا طبقہ تحریک پاکستان کے ہراول دستہ کے طور پر قیام پاکستان کی جدوجہد میں شریک تھا۔ آخر ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب تحریک پاکستان میں مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا عبدالحامد بدایونیؒ، پیر صاحب مانکی شریفؒ، مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹیؒ۔ اور ان کے ہزاروں رفقاء کے وجود کو کس طرح نظرانداز کر جاتے ہیں جو نہ صرف تحریک پاکستان کی صفِ اوّل میں شامل تھے بلکہ صوبہ سرحد اور سلہٹ میں پاکستان کے حق میں ریفرنڈم جیتنے میں انہی علماء کا رول بنیادی اور فیصلہ کن رہا ہے اور اگر یہ کہا جائے تو حقائق کی بالکل صحیح ترجمانی ہوگی کہ تحریک پاکستان کے نظریاتی اور اسلامی تشخص پر عوام کا اعتماد انہی علماء و مشائخ کی بدولت قائم ہوا تھا۔ پھر یہ کہنا کہ علامہ محمد اقبالؒ اور قائداعظمؒ اسلام کی تعبیر و تشریح کے بارے میں جمہور مسلمانوں سے ہٹ کر کسی نئے فکر کے داعی تھے ان دونوں شخصیات کے ساتھ انصاف نہیں ہے یہ درست ہے کہ علامہ محمد اقبالؒ نے دین کی تعبیر و تشریح اور اجتہاد کی عمومی ضرورت کے حوالہ سے اپنے خیالات و افکار پیش کئے ہیں جو عام علماء کے موقف سے مختلف ہیں لیکن انہوں نے ان افکار و خیالات

کو فقہی مذہب اور نئے مکتبِ فکر کے طور پر کبھی پیش نہیں کیا اور نہ ہی اس پر اصرار کیا ہے کہ ان کے خیالات کو من وعن قبول کر لیا جائے ہمارے نزدیک اس ضمن میں علامہ محمد اقبالؒ کے افکار کی حیثیت تجاویز کی ہے جو انہوں نے علمی حلقوں کے سامنے پیش کیں اور علمی حلقوں کا اجتماعی طرزِ عمل شاہد ہے کہ انہوں نے علامہ محمد اقبال کے تمام تر احترام کے باوجود ان تجاویز کو قبول نہیں کیا لیکن اس توازن کے ساتھ کہ نہ تو ان شاذ افکار کی بنیاد پر علامہ محمد اقبالؒ کو اپنے روایتی طرزِ تنقید کا ہدف بنایا ہے اور نہ ہی ان کے افکار کو من وعن قبول کیا ہے۔

جمہور اہلِ علم کے اس حق سے ڈاکٹر جاوید اقبال بھی انکار نہیں کریں گے کہ وہ کسی بھی سوچ اور فکر کو خواہ وہ کتنی ہی بڑی شخصیت کی طرف سے آئی ہو اگر دین وعلم کے مسلّم اصول و ضوابط سے ہٹا ہوا دیکھیں تو اسے قبول کرنے میں احتیاط سے کام لیں کیونکہ جب ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب علامہ محمد اقبالؒ کے حوالہ سے اپنے لیے یہ حق مانگتے ہیں کہ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے متفقہ اور اجماعی فیصلوں کو مصلحتِ وقت کے موافق نہ پائیں تو قبول نہ کریں تو علامہ محمد اقبالؒ کی کسی سوچ اور رائے کی حیثیت صحابہ کرامؓ کے اجماع سے زیادہ تو نہیں ہے کہ اسے ہر صورت قبول کرنے پر اصرار کیا جائے اور کسی کو اس سے اختلاف کا حق نہ دیا جائے پھر جب بات جمہوریت کی ہے تو یہ اصول اہلِ علم کے لیے کیوں نہیں ہے اور ملک کے جمہور اہلِ علم اور اہلِ دین کے مقابلہ میں ایک شخصی رائے پر اصرار کیوں کیا جا رہا ہے۔

بہر حال ہم یہ سمجھتے ہیں کہ علامہ محمد اقبالؒ دین میں تعبیر وتشریح کے حوالہ سے کسی نئے فقہی مذہب اور مکتبِ فکر کے بانی اور داعی نہیں تھے نہ انہوں نے اس کا دعویٰ کیا نہ اس کے لیے حلقہ بنایا اور نہ ہی عامۃ الناس کو دعوت دی کہ وہ علماء کی بیان کردہ تشریحِ دین کو مسترد کر کے ان کے اس بیّنہ مکتبِ فکر کو قبول کریں بات صرف اتنی تھی کہ علامہ محمد اقبالؒ نے ایک مفکر اور فلسفی کی حیثیت سے خیر خواہی کے جذبہ کے ساتھ اپنے افکار وخیالات کو تجاویز کی صورت میں اہل علم کے سامنے پیش کیا لیکن جمہور اہلِ علم نے مرحوم کے خلوص، جذبہ خیر خواہی اور احترام کے باعث انہیں خاموشی کے ساتھ نظر انداز کر دیا جس سے بات ختم ہو گئی لیکن اب ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب تاریخ کے حوالے ہو جانے والے اس مسئلہ کو دوبارہ زندہ کرنا چاہتے ہیں اور اپنے قابلِ صد احترام مرحوم والد کے کندھے پر رکھ کر ایک نئے مکتبِ فکر کے قیام کی بندوق داغنے کے درپے ہیں تو یہ خود علامہ محمد اقبالؒ کے ساتھ زیادتی ہے باقی رہی بات

تحریکِ پاکستان کی تو یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ تحریک پاکستان کا اسلامی اور نظریاتی تشخص مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا عبدالحامد بدایونیؒ، پیر صاحب مانکی شریفؒ مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی اور ان کے اہلِ علم رفقاء سے وابستہ ہے۔ اس لیے پاکستان میں اسلام کی تعبیر و تشریح انہی اصول و ضوابط کے مطابق ہوگی جن کے یہ مذکورہ بالا اہلِ علم داعی ہیں اور وہ اصول و ضوابط ان حضرات کے طے کردہ نہیں ہیں بلکہ چودہ سو سال سے امت کا اجماعی تعامل انہی اصولوں پر ہے اور آج بھی پاکستان بلکہ پورے عالم اسلام کے جمہور اہلِ علم ان اصول و ضوابط کو تسلیم کرتے ہیں۔

اب آیئے اجتہاد کی عمومی ضرورت اور پارلیمنٹ کو اجتہاد کا حق دینے کے سوال کیطرف تو اس سے کسی کو انکار نہیں ہے کہ آج کے دور میں بدلتے ہوئے تقاضوں کے پیش نظر وسیع تر اجتہاد کی ضرورت ہے علماء بھی اس ضرورت کو تسلیم کرتے ہیں بلکہ اپنے اپنے دائرہ کار میں اجتہاد کر بھی رہے ہیں ملک کے ہر بڑے جامعہ اور دارالعلوم میں دارالافتاء موجود ہے اور مفتیان کرام روزمرہ پیش آمدہ مسائل و امور پر فتوے جاری کر رہے ہیں ان فتاویٰ میں جمود نہیں ہے بلکہ اجتہاد و تحرک پوری طرح کارفرما ہے مفتیان کرام عمومی ضروریات اور مصلحتوں کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے پیش رو فقہاء کرام کے فیصلوں سے اختلاف بھی کر رہے ہیں اور بوقتِ ضرورت دوسرے فقہی مذاہب کے فیصلوں کو اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ نئی آراء بھی قائم کر رہے ہیں دینی اداروں کے شعبہ ہائے فتاویٰ سے ہٹ کر قومی سطح پر اسلامی نظریاتی کونسل کے پلیٹ فارم پر نفاذِ اسلام کے لیے جو علمی کام گذشتہ دس سال کے دوران ہوا ہے اس میں تمام مکاتبِ فکر کے علماء کرام نے مل بیٹھ کر پیش آمدہ مسائل کا حل نکالا ہے مسودات قانون ترتیب دیے ہیں اور متعدد نئے فقہی نکات اٹھائے ہیں اجتہاد اسی کا نام ہے اور اجتہاد کا یہ عمل انفرادی اور اجتماعی سطح پر جاری و ساری ہے بلکہ اسلامی نظریاتی کونسل اور وفاقی شرعی عدالت میں علماء کرام نے اجتہاد اور تعبیر دین کے اس عمل میں جدید قانون دان حضرات کے ساتھ اشتراک کو فراخدلی کے ساتھ قبول کیا ہے اور مل جل کر "اجتہاد" کے اس عمل کو آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے اور اس سے بھی آگے بڑھ کر "شریعت بل" کے ذریعہ قرآن و سنت کی تعبیر و تشریح کے تمام تر اختیارات وفاقی شرعی عدالت کے حوالہ کر دیے ہیں جس میں عصری قانونی ماہرین کو علماء پر عددی برتری حاصل ہے یہ متواتر پیش رفت اس

امر کی شاہد ہے کہ علماء نہ تو فقہی جمود کے قائل ہیں نہ اجتہاد کی راہ میں رکاوٹ ہیں اور نہ ہی اجتہاد اور تعبیر دین پر اپنی اجارہ داری قائم رکھنے کے درپے ہیں البتہ وہ یہ بات ضرور کہتے ہیں کہ اجتہاد کے عمل کو صحیح طور پر آگے بڑھانے کے لیے دو امور کی پابندی بہر حال ضروری ہے ایک اجتہاد کا دائرہ کار اور دوسرا اجتہاد کی اہلیت کیونکہ ان دو باتوں کا لحاظ رکھے بغیر اجتہاد کے نام پر کیا جانے والا کوئی بھی عمل اجتہاد نہیں ہوگا بلکہ الحاد اور زندقہ کی حدود میں داخل ہو جائے گا۔

اجتہاد کا دائرہ کار خود جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبلؓ والی حدیث میں متعین فرما دیا ہے کہ جس مسئلہ میں قرآن کریم اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی واضح حکم نہ ہو اس میں مجتہد کو اجتہاد کا حق حاصل ہے۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ قرآن وسنت کے صریح احکام دائرہ اجتہاد سے خارج ہیں اور ان میں اجتہاد کے نام پر کسی قسم کے ردو بدل کی گنجائش نہیں ہے۔ اب اگر کوئی شخص یا ادارہ قرآن وسنت کے کسی صریح حکم کو تبدیل کرنا چاہتا ہے اور اسے "اجتہاد" کا نام دیتا ہے تو علماء اسے تسلیم نہیں کرتے اور اسے الحاد قرار دیتے ہیں۔ لیکن ہمارے مہربانوں کو شکوہ ہے کہ علماء جمود کے قائل ہیں اور اجتہاد سے انکار کر رہے ہیں۔

اجتہاد کے ضمن میں دوسرا بنیادی پہلو "اہلیت" کا ہے یہ ایک بدیہی امر ہے کہ قرآن وسنت کی تشریح وتعبیر کے لیے قرآن وسنت سے واقفیت ضروری ہے ایک شخص جو قرآن کریم کی کوئی آیت یا حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی جملہ پڑھ کر براہ راست اس کا مفہوم سمجھنے سے قاصر ہے تو اسے قرآن وسنت کا شارح تسلیم نہیں کیا جا سکتا یہ ایک ایسی بدیہی بات ہے جس پر کسی دلیل اور بحث کی ضرورت نہیں ہے بلکہ امام ولی اللہ دہلویؒ نے تو اجتہاد کے لیے قرآن وسنت سے واقفیت کا بہت بلند معیار بیان کیا ہے اور "ازالۃ الخفاء" میں اجتہاد کی اہلیت کے لیے ایک درجن سے زائد علوم کی مہارت کو شرط قرار دیا ہے ان کی یہ بات بالکل منطقی اور معقول ہے جس کی تفصیل میں جائے بغیر صرف ایک مثال سے ہم اپنے موقف کو واضح کریں گے۔

امام ولی اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں کہ مجتہد کے لیے ضروری ہے کہ وہ دیگر ضروری علوم کی مکمل مہارت کے ساتھ ساتھ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ اور حالاتِ

زندگی پر بھی گہری نظر رکھتا ہو کیونکہ بسا اوقات اس کے سامنے کئی مسئلہ میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دو یا تین متفاوت ارشادات یا عمل آئیں گے اس نے ان میں سے کسی ایک کو ترجیح دینی ہے ظاہر ہے کہ وہ ان میں سے آخری عمل کو ناسخ قرار دے کر قبول کرے گا اور باقی کو منسوخ سمجھے گا۔ اب وہ آخری عمل کا فیصلہ کیسے کرے گا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اسے جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور احوال سے اس قدر واقفیت حاصل ہو کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال میں واقعاتی ترتیب قائم کر سکے اور یہ فیصلہ کر سکے کہ پہلا عمل کونسا ہے اور آخری عمل کونسا ہے اس کے بغیر یہ فیصلہ کرنا اس کے لیے ممکن ہی نہیں ہے۔

یہ صرف ایک مثال ہے جو بات سمجھانے کے لیے عرض کی گئی ہے ورنہ جن چودہ علوم کو حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اجتہاد کی اہلیت کے لیے شرط قرار دیا ہے ان میں سے ہر علم مجتہد کے لیے منطقی اور بدیہی طور پر اسی طرح ضروری ہے۔ اس پس منظر میں جب پارلیمنٹ کو اجتہاد کا حق دینے کی بات کی جاتی ہے تو علماء کو اس میں تامل ہوتا ہے اور وہ تامل بلا وجہ نہیں ہے کیونکہ ہمارے ہاں پارلیمنٹ کی رکنیت کے لیے ضروری علوم کی مہارت تو کجا قرآن کریم کو سادہ ترجمہ کے ساتھ سمجھنا بھی شرط نہیں ہے آخر ایک ایسے ادارہ کے لیے جس کے ارکان کی غالب اکثریت قرآن وسنت سے ناواقف ہے اور جس کی رکنیت کے لیے قرآن کریم کا سادہ ترجمہ جاننا بھی شرط نہیں قرآن وسنت کی تعبیر وتشریح اور اجتہاد کا حق علماء آخر کیسے تسلیم کر لیں۔

پھر اہلیت کا یہ صرف ایک پہلو ہے کہ اجتہاد کا حق صرف اسے ہے جسے ضروری علوم پر مہارت حاصل ہو اس کا دوسرا پہلو خدا خوفی اور تقویٰ کا بھی ہے جو علمی اہلیت کے ساتھ اسی کی سطح پر ضروری ہے ہمارے فقہاء کے ہاں تو خدا خوفی اور تقویٰ کا یہ معیار رہا ہے کہ حضرت امام ابو حنیفہؒ اپنے قرض خواہ کے مکان کی دیوار کے سائے میں کھڑا ہونے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ اس طرح قرض کے ساتھ سایۂ دیوار میں کھڑا ہونے کا نفع شامل ہو جائے گا جو سود بن سکتا ہے ان مجتہدین کے اجتہاد کا حق ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب اس پارلیمنٹ کے حوالے کرنا چاہتے ہیں جس کی ہارس ٹریڈنگ کے قصے دنیا بھر میں ہماری قومی رسوائی کا باعث بن رہے ہیں۔

لیکن علماء کو اس سے بھی انکار نہیں ہے اگر وہ وفاقی شرعی عدالت اور اسلامی نظریاتی کونسل کے حق میں اجتہاد کے حق سے دستبردار ہو سکتے ہیں تو پارلیمنٹ کے سامنے سپر انداز

ہونے میں بھی انہیں کوئی حجاب نہیں ہے البتہ اجتہاد کے دائرہ کار اور اہلیت کے اصولوں سے دستبردار ہونے کے لیے وہ کسی صورت میں تیار نہیں ہیں اور اس کے لیے دو امور کو آئینی طور پر قطعیت کے ساتھ طے کرنا ہوگا ایک یہ کہ پارلیمنٹ قرآن وسنت کے صریح احکام میں ردوبدل کی مجاز نہیں ہوگی اور دوسرا یہ کہ پارلیمنٹ کی رکنیت کے لیے قرآن وسنت کی ضروری واقفیت شرط ہوگی محترم ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب ان دو امور کو تسلیم کرلیں تو پارلیمنٹ کو اجتہاد کا حق دینے کے بارے میں ان کے موقف کو قبول کرنے کے لیے ہم پوری طرح تیار ہیں بلکہ اجتہاد کی اہلیت کے لیے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی بیان کردہ سخت شرائط پر بھی ہمیں اصرار نہیں ہوگا اور اس ضمن میں بھی ہم اسلامی نظریاتی کونسل یا وفاقی شرعی عدالت کا یہ استحقاق تسلیم کرتے ہیں کہ وہ پارلیمنٹ کو قرآن وسنت کی تعبیر وتشریح اور اجتہاد کا حق دینے کا مقصد سامنے رکھ کر پارلیمنٹ کی رکنیت کے لیے قرآن وسنت سے واقفیت کا معیار طے کر دیں لیکن ان بنیادی امور کو ملحوظ رکھے بغیر اگر پارلیمنٹ کو قرآن وسنت کی تعبیر وتشریح کا حق دیا جاتا ہے اور پارلیمنٹ اسے استعمال کرتی ہے تو ہمارے نزدیک پاپائے روم کی بائیبل میں ردوبدل کا حق رکھنے والی کونسل کے فیصلوں، اکبر بادشاہ کے درباری اجتہاد کے ذریعہ وجود میں آنیوالے دین الٰہی اور اجتہاد کے غیر مشروط حق سے بہرہ ور منتخب پارلیمنٹ کے فیصلوں میں کوئی فرق نہیں ہوگا۔

اب ہم تیسرے نکتہ کی طرف آتے ہیں جس میں ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب نے پارلیمنٹ اور شریعت میں سے کسی ایک کی بالادستی کی صورت میں دوسرے کی حیثیت مجروح ہونے کو تسلیم کیا ہے اور اس طرح علماء کے اس موقف کو پہلی بار سنجیدگی کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ پارلیمنٹ کی مکمل بالادستی کی صورت میں شریعت کی بالادستی نہیں رہے گی اور یہ نہ صرف شریعت کی توہین ہے بلکہ ایک عام مسلمان کے بنیادی عقیدہ کے بھی منافی ہے لیکن اس کا حل ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب نے قانون نفاذِ شریعت پر پارلیمنٹ کی بالادستی برقرار رکھنے کی صورت میں تجویز کیا ہے اور اس میں کسی قسم کی لچک کے روادار نہیں ہیں ہمیں ان کے اس موقف سے اختلاف ہے کیونکہ ایک مسلمان کی حیثیت سے ہمارا بنیادی عقیدہ ہے کہ قرآن وسنت کو دنیا کے ہر ادارے پر بالادستی حاصل ہے اور کوئی منتخب یا غیر منتخب ادارہ ایسا نہیں ہے جسے قرآن وسنت کے احکام پر بالادستی دی جاسکے۔

اب ہم ملک امجد حسین صاحب ایڈووکیٹ کے اٹھائے ہوئے دو نکات کی طرف آتے

ہیں۔ ان سے بہلانکتہ یہ ہے کہ قرار دادِ مقاصد میں "شریعت" کا لفظ تک نہیں ہے تو شریعت بل کے لیے اس کا حوالہ کیوں دیا جا رہا ہے مگر یہ بات انتہائی سطحی ہے جس کی اتنے بڑے قانون دان سے کم از کم ہمیں توقع نہیں تھی۔

"شریعت" کی اصطلاح خود قرآن کریم کی ارشاد فرمودہ ہے چنانچہ ارشاد باری تعالےٰ ہے۔

ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَىٰ شَرِيعَةٍ مِّنَ الْأَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ (الجاثیۃ)

پھر ہم نے آپؐ کو دین کے بارے میں "شریعت" پر قائم کیا ہے پس آپؐ اس کی پیروی کریں اور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کریں جو علم نہیں رکھتے۔

اور قرار داد مقاصد کے دو اقتباسات ملاحظہ فرمائیے۔

۱: "مملکت جملہ حقوق و اختیارات حکمرانی جمہور کے منتخب کردہ نمائندوں کے ذریعے استعمال کرے جس میں اصولِ جمہوریت وحریت و مساوات و رواداری اور عدل عمرانی کو جس طرح اسلام نے انکی تشریح کی ہے پورے طور پر ملحوظ رکھا جائے"۔

۲: مسلمانوں کو اس قابل بنایا جائے کہ انفرادی و اجتماعی طور پر اپنی زندگی کو اسلامی تعلیمات و مقتضیات کے مطابق جو قرآن مجید اور سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں متعین ہیں ترتیب دے سکیں"۔

اب آپ خیال فرمائیے کہ قرار داد مقاصد نے دستوری طور پر اسلام کی تشریحات اور قرآن و سنت کی تعلیمات کی پابندی کو ضروری قرار دیا ہے اور قرآن کریم نے "شریعت" کی پیروی کا حکم دیا ہے تو شریعت کے قرآنی حکم کو اختیار کرنا قرار داد مقاصد ہی کی تکمیل نہیں تو اور کیا ہے قرار داد مقاصد ایک اصولی دستاویز ہے ملک میں اسلامائزیشن کے لیے جتنے اقدامات بھی ہوں گے۔ اس قرار دادِ مقاصد پر عملدرآمد میں پیش رفت شمار ہوں گے اس کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ قرار دادِ مقاصد میں ان سب کا تفصیلاً ذکر بھی ہو۔ یہ ایسے ہی ہے، جیسے سپریم کورٹ نے قصاص و دیت آرڈی ننس جاری کرنے کا حکومت کو پابند کیا ہے اور حکومت چند روز تک آرڈی ننس لا رہی ہے اب کوئی شخص یہ کہے کہ قرار داد مقاصد میں تو "حدود و قصاص"

کا لفظ تک نہیں ہے اس لیے اس آرڈی ننس کے سلسلہ میں قرار داد مقاصد کا حوالہ نہ دیا جائے تو یہ بات بالکل غلط ہوگی کیونکہ "حدود و قصاص" کے قانون کا نفاذ بلاشبہ قرار دادِ مقاصد کی اس شق پر عمل درآمد ہوگا۔ جس میں مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں اسلامی تعلیمات کی پابندی کی ضمانت دی گئی ہے۔ رہا دوسرا نکتہ کہ قرار دادِ مقاصد کو آئین کا عملی حصہ بنا کر معرضِ خطر میں ڈال دیا گیا ہے تو یہ خدشہ سابقہ تجربات کی بنیاد پر بے بنیاد ہے کیونکہ پاکستان میں آئین ٹوٹنے اور نئے دستور ترتیب پانے کا افسوسناک عمل اگرچہ متعدد بار دہرایا گیا ہے لیکن قرار دادِ مقاصد کو کوئی دستور بھی نظر انداز نہیں کر سکا اور ہر آئین میں اسے شامل کیا گیا ہے اس طرح ۱۹۴۹ء میں پہلی دستور ساز اسمبلی میں منظور ہونے والی قرار داد مقاصد کو ملک کی ایک بنیادی دستاویز کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے جسے کسی بھی دور میں نظر انداز نہیں کیا جا سکے گا قرار دادِ مقاصد میں پاکستان کی اسلامی نظریاتی حیثیت کو ہمیشہ کے لیے طے کر دینے کے علاوہ خدا کی حاکمیت، قرآن و سنت کی بالادستی اور اسلامی احکام کی عمل داری کی ضمانت دی گئی ہے اور اسلامائزیشن کی ایک مستحکم اور مضبوط آئینی بنیاد فراہم کی گئی ہے۔

جنرل محمد ضیاء الحق مرحومؒ کی طرف سے قرار داد مقاصد کو دستور کا باضابطہ حصہ قرار دیے جانے سے قبل قرار دادِ مقاصد کو ۱۹۷۳ء سمیت تمام دساتیر میں محض دیباچہ کی حیثیت سے بطور تبرک شامل کیا جاتا رہا ہے جس پر عمل درآمد آئینی لحاظ سے ضروری نہیں تھا مگر جنرل محمد ضیاء الحق مرحومؒ نے سپریم کورٹ کے فیصلہ کے تحت حاصل شدہ اختیارات کی رو سے قرار دادِ مقاصد کو آئین کا باضابطہ اور قابلِ عمل حصہ بنا دیا جو قرار دادِ مقاصد کا اصل دستوری مقام ہے اور بلاشبہ یہ جنرل محمد ضیاء الحق مرحومؒ کا ایک اہم کارنامہ ہے۔

بقیہ تعارف و تبصرہ

زیر نظر رسالہ گولڑہ شریف کے سجادہ نشین محترم جناب سید نصیر الدین نقشبندی کی ایک ضخیم کتاب کے ایک حصہ کا جواب ہے جس میں انہوں نے بنو امیہ کے اکابر کے بارے میں یکطرفہ پراپیگنڈہ سے متاثر ہو کر روایتی انداز میں خلافِ حقیقت باتیں لکھ دی ہیں مولانا حسین احمد قریشی نے ان امور پر باحوالہ بحث کی ہے اور بنو امیہ کے زعماء کے بارے میں معاندانہ پراپیگنڈہ کو بے نقاب کیا ہے۔